ابوسفیان اصلاحی

سرسیّد احمد خان
اور
عیسائی مبلّغین و مؤرخین - ۲

[زیر نظر مقالے کی پہلی قسط جولائی ۱۹۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ حسبِ ذیل قسط پر مقالہ مکمل ہوگیا ہے۔ مدیر]

حضرت اسماعیل علیہ السلام

سرسید لکھتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو گھر سے نکالا تھا تو اس وقت ان کی کیا عمر تھی؟ اس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں ہے اور خود بخاری کی روایتیں بھی اس سلسلے میں مشتبہ ہیں اور توریت مقدس میں بھی ان کی عمر کے باب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ سرسید نے بتایا کہ توریت کی چودہویں آیت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی عمر بہت کم تھی، لیکن دوسری آیات اس کے برعکس ہیں[۳۲]۔

سرسید نے اس سلسلے میں عیسائی مؤرخین کے خیالات کو بھی نقل کیا ہے۔ مسٹر فاسٹر لکھتے ہیں کہ

> اگر ہم حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر پر غور کریں تو رنج آگیں شوق اور بھی دو بالا ہو جاتا ہے، یہ لڑکا اب کچھ بچہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ کم از کم پندرہویں برس میں تھا، مگر تکلیف کی وجہ سے بچہ کی طرح مضمحل ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں اس کی بے چاری ماں جب تک کہ اس کی طاقت رہی ہوگی اور جب وہ تھک گئی ہوگی تو اس کو ایک جھاڑی کے نیچے ڈال دیا ہوگا۔

سرسید نے مسٹر فاسٹر کی اس تاویل کو لغو قرار دیا ہے۔ مسٹر فاسٹر مزید لکھتے ہیں کہ ٹھیک ٹھیک حضرت اسماعیل کی عمر معلوم ہو سکتی ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں ان کا ختنہ ہوا تھا۔ حضرت اسحاق اس وقت تک پیدا نہیں ہوئے تھے، بلکہ اس کے اگلے سال پیدا ہوئے ہیں اور حضرت ہاجرہ اور ان کے

بیٹے کے بیابان میں بھیجے جانے سے پیشتر ان کا یعنی حضرت اسحاق کا دودھ چھوٹ چکا تھا[۳۳]۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر کے سلسلے میں سرسید دوسرے عیسائی مورخین کے خیالات نقل کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ خود ان میں آپس میں کس قدر تضادات واقع ہیں۔ "توریت اور انجیل کے اکثر محققین جیروم لی کلوک اور کروز ملر کا خیال ہے کہ حضرت اسماعیل کی عمر اس وقت سترہ برس کی تھی،" اِس لیے یہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت ہاجرہ نے ان کو اپنے کندھے پر رکھ لیا ہو۔

سرسید نے مذکورہ بالا خیالات پر یوں تبصرہ فرمایا کہ "اصل واقعہ صرف اتنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی پہلی بی بی سارہ کے کہنے سے اپنی دوسری بی بی ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کو جو ہوشیار اور بڑے ہوگئے تھے، گھر سے نکال دیا اور وہ دونوں بیابان میں چلے گئے۔ چلتے چلتے اور منزلیں طے کرتے ہوئے وہ اس مقام پر پہنچے جہاں اب مکہ ہے۔ پیاس کی وجہ سے حضرت اسماعیل کی حالت خراب ہوگئی اور مرنے کی نوبت پہنچ گئی۔ حضرت ہاجرہ ان کو ایک درخت کے سایہ میں بٹھا کر پانی کی تلاش کو اِدھر اُدھر دوڑتی پھریں اور بمشکل پانی ملا اور جہاں پانی ملا تھا، اسی جگہ انہوں نے سکونت اختیار کر لی، کیونکہ عرب میں اسی جگہ لوگ سکونت اختیار کرتے تھے جہاں پانی دستیاب ہوتا تھا[۳۴]۔"

فاران

فاران کے سلسلے میں بھی عیسائی مورخین نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ سرسید نے ان کی غلط بیانی کا پردہ چاک کیا ہے اور بتایا کہ "مجھے معلوم نہیں کہ کسی غیر ملک اور مذہب کے مورخ نے فاران اور حجاز کو جہاں اب مکہ معظمہ واقع ہے ایک ہی قرار دیا ہو۔ لیکن عربی ترجمہ توریت سامری میں جس کو آر کوئی ٹن صاحب نے ۱۸۵۱ء میں بمقام لگڈنی بٹاروم چھپوایا ہے، اس میں فاران اور حجاز سے ایک ہی جگہ مراد لیا ہے[۳۵]۔"

عیسائی مورخ فاران اور حجاز کو ایک ہی جگہ قصداً اس لیے قرار دیتے ہیں کہ الگ الگ ماننے سے انہیں اس پیشین گوئی کو بھی ماننا پڑے گا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں ہے کہ وہ نبی ہیں۔ فاران کے متعلق عیسائی مورخوں کے بیان تین طرح کے ہیں۔ ایک تو یہ کہ فاران وہ وسیع قطعہ زمین ہے جو بیَرشبع کی شمالی حد سے لے کر کوہ سینا تک چلا گیا ہے۔ دوسرے یہ ہے کہ قادیش جہاں کہ حضرت ابراہیم نے ایک کنواں موسوم بہ بیَرشبع کھودا تھا، اور فاران ایک ہی مقام ہے۔ تیسرا یہ کہ فاران اس بیابان کا نام ہے جو کوہ سینا کے مغربی ڈھلاؤ پر واقع ہے۔ بے شمار عمارتوں اور پرانی قبروں اور میناروں وغیرہ کے آثار وہاں اب بھی پائے جاتے ہیں۔ مسٹر روبر کا بیان ہے کہ میں نے ایک کلیسیا کے نشانات جو پانچویں صدی عیسوی میں بنایا گیا ہوگا، دریافت کیے۔ سرسید نے توریت سے استدلال

کرتے ہوئے بتایا کہ یہ تمام بیانات حقیقت سے پرے ہیں [۳۶]۔

عیسوی مذہب

سرسید کا خیال کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ عیسوی مذہب تیسری صدی عیسوی میں ملک عرب میں آیا [۳۷]، لیکن عیسائی مصنّفوں کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ عیسوی مذہب نے اہل عرب میں بہت ترقی حاصل کی تھی، مگر ہم اس باب میں ان سے اتفاق نہیں کرتے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ باستثنائے صوبہ نجران کے جس کے اکثر باشندوں نے عیسوی مذہب اختیار کر لیا تھا، قبائل حمیر، غسان، ربیعہ، تغلب، بجرو تنوخ، ملے، توریہ اور حیرہ کے متعدد اشخاص نے ان کی تقلید کی تھی اور کوئی جماعت کثیر یا قوم کی قوم عیسوی مذہب میں نہیں آئی تھی [۳۸]۔

اسلام دینِ رحمت

مستشرقین اور عیسائی مصنّفین نے طرح طرح سے اسلام کو ایک جابر و قاہر مذہب قرار دیا ہے کہ اسلام نے دنیا میں ظلم و فساد کی اشاعت کی اور طاقت و قوت سے دنیا کی فرمانروائی پر قبضہ کر لیا [۳۹]۔ سرسید نے اپنی کتاب میں ولیم میور کے اس خیال کی تردید کی ہے اور بتایا کہ "مذہب اسلام انسان کے حق میں رحمت ہے اور موسوی اور عیسوی مذہب کو اس سے بہت فائدے پہنچے ہیں [۴۰]"، "لیکن جو بات مذہبِ اسلام کے متعلق ہوتی ہے اس کو عیسائی مصنّف ہمیشہ بدظنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نیکی کو چھوڑ کر بدی پر عمل کرتے ہیں [۴۱]"۔

سرسید نے عیسائی مصنّفین کے اس خیال کی تردید خود انہی کے مکتبِ فکر کے مصنّفین سے کی ہے۔ مشہور عیسائی مؤرخ گبن لکھتا ہے کہ محمد ﷺ کی سیرت میں سب سے اہم چیز غور کرنے کی یہ ہے کہ وہ دنیا کے لیے کیسے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک متعصّب عیسائی اور یہودی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ﷺ کی رسالت دنیا کے لیے باعث رحمت نہیں تھی [۴۲]۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے بھی آنحضور ﷺ کے سلسلے میں نہایت سچائی کا اظہار کیا ہے کہ یہ خیال درست نہیں کہ قرآن کے عقائد بزور شمشیر پھیلائے گئے۔ جن کے دل تعصّب سے مبرا ہیں، وہ اس کو تسلیم کریں گے کہ محمد کا دین مشرقی دنیا کے لیے ایک برکت تھا اور مذہبِ اسلام اور مذہبِ عیسوی کا موازنہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مذہب اسلام کے احکام لوگوں کے لیے زیادہ مفید ہیں۔ یہ بات بھی عیاں ہے کہ علوم و فنون کو سب سے پہلے زندہ کرنے والے ایشیا کے مسلمان اور اندلس کے مؤرخ تھے۔ یہ بات مشہور ہے کہ اہل عرب میں چھ سو برس سے علوم و فنون جاری تھے اور یورپ میں جہالت عروج پر تھی، یہ بات بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ تمام علوم طبیعیات، ہیئت، فلسفہ اور ریاضی جو

دوسری صدی میں یورپ میں جاری تھے، ابتداءً عرب کے علماء سے حاصل ہوئے تھے اور خصوصاً اندلس کے مسلمان یورپ کے فلسفہ کے موجد خیال کیے جاتے ہیں [۴۳]۔

طامس کارلائل نے بھی اسلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے کہا کہ اسلام آنے سے قبل عرب تہذیب و تمدن میں بہت پیچھے تھے اور گلہ بانی ان کا پیشہ تھا، دُنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا، لیکن اس قوم میں اولوالعزم پیغمبر ایک ایسے کلام کے ساتھ آیا جس پر وہ یقین کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے وہ پوری دنیا پر چھا گئے اور ایک صدی کے اندر غرب کی طرف غرناطہ اور ایک طرف دہلی ہو گئی۔ ایک زمانے تک عرب کی بہادری کا سکہ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر جاری تھا [۴۴]۔

تعدّد ازواج

سرسیّد نے تعدد ازواج کا جائزہ تین پہلوؤں سے لیا ہے، ایک قانونِ قدرت یعنی اللہ تعالیٰ نے جن ذی روح کی نسبت یہ فیصلہ کیا کہ ان کے صرف ایک ہی مادہ ہو، ان کی نسل ہمیشہ جوڑا جوڑا پیدا ہوتی ہے، اس لیے جس طرح کثرت ازواج اکثر حالتوں میں قابلِ نفرت ہے، ویسے قطعی التزام ایک سے زیادہ نہ ہونے کا خلافِ فطرت ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان مدنی الطبع ہے، اس لیے اس کا اکیلا ہونا اس کے لیے مناسب نہیں ہے اس لیے اسے ایک ساتھی یعنی عورت دی جو اس کے دکھ درد اور خوشی کی ساتھی ہو [۴۵]۔ تیسرے یہ کہ شارع نے تعدّد ازواج کی اجازت نہایت محدود اور خاص حالت میں دی ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر خوف عدل ہو تو صرف ایک کرنی چاہیے [۴۶]۔

اوپر آپ نے سرسیّد کا خیال ملاحظہ کیا۔ اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے عیسائی مؤرخین کے خیال کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسٹر ہگنز اور مانٹگیو نے بتایا کہ تعدّد ازواج امور طبعی میں سے ہے، جب کہ مذہب اسلام میں یہ خاص اجازت حالات خاص میں صرف امورات طبعی کے لحاظ سے نہیں دی گئی ہے، بلکہ اس کی غرض یہ ہے کہ تزویج کی تلخیوں کے واسطے اور مقاصد تزوّج کے فوت ہو جانے سے ایک تدارک حاصل ہو جو عین مرضی آدم و حوا کے پیدا کرنے والے کی اس کی قدرت کے کاموں کی نشانیوں سے معلوم ہوتی ہے۔

مسٹر جان ڈیون پورٹ نے مانٹگیو کی رائے نقل کر کے بتایا کہ عرب چونکہ گرم ملک ہے، اس لیے لڑکیاں تو دس برس میں نکاح کے لائق ہو جاتی ہیں اور بیس سال میں بڑھیا۔ اس لیے یہ قدرتی امر ہے کہ ان ملکوں میں جب کوئی قانون مانع نہ ہو تو انسان ایک جورو کو طلاق دے کر دوسری جورو کر لے، اور تعدّد ازواج کا طریقہ جاری کیا جائے۔ سرڈبلو اوسلی کا خیال ہے کہ ایشیا کے گرم ملکوں کی تاثیر سے مرد و عورت کے مزاج میں اختلاف ہوتا ہے جو یورپ کی آب و ہوا میں نہیں ہے جہاں دونوں برابر برابر اور بتدریج عالمِ ضعیفی میں پہنچتے ہیں، مگر ایشیا میں صرف مرد ہی عالم ضعیفی میں بھی قوی رہتا

ہے۔ سر سید اس پر تبصرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر یہ بات سچ ہے تو مذہب اسلام نے جو تعدّد ازواج کی اجازت دی ہے، اس میں ایک اہم حکمت ہے۔ مسٹر ڈیون پورٹ نے توریت کی بہت سی آیات کی روشنی میں بتایا کہ تعدّد ازواج میں ایک برکت پوشیدہ ہے[۴۷]۔ جان ملٹن نے بھی تعدد ازواج کو جائز قرار دیا ہے[۴۸]۔

ازواجِ مطہرات

سرسید نے اپنی پوری زندگی اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے میں بسر کر دی گو کہ ان سے بہت سی اجتہادی غلطیاں بھی واقع ہوئی ہیں اور یہ غلطیاں ایسی ہیں کہ بظاہر ان سے اسلام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، لیکن سرسید کو پڑھنے والے جانتے ہیں کہ اسلام کے تئیں ان کے دل میں جو سچے جذبات تھے، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی بھر عیسائیت سے برسرِ پیکار رہے جس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ وفات سے فوراً قبل ایک عیسائی کی کتاب "امہات المومنین" کا جواب رقم فرمایا۔ عیسائی مصنّف نے اپنے رسالہ میں آنحضور ﷺ اور ازواجِ مطہرات کی نسبت نہایت دریدہ دہنی سے کام لیا تھا۔ اس میں انہوں نے ایک طرف جواب دیا اور دوسری طرف کوشش یہ کی کہ ازواجِ مطہرات کا تاریخی حال اور ان کی نسبت بعض اعتراضات کا جواب لکھوا دیں، لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ صرف حضرت خدیجہؓ، حضرت سودہؓ، حضرت زینبؓ بن جحش، حضرت حفصہؓ، حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت زینبؓ تک ہی برقرار رہا اور باقی ازواجِ مطہرات کی نسبت لکھنے کی خواہش پائے تکمیل کو نہ پہنچ سکی کیونکہ اللہ نے انھیں اپنے پاس بلالیا[۴۹]۔

سرسیّد نے اس رسالہ میں عیسائی مصنّف کا جواب توریت، انجیل، قرآن کریم، حدیث اور تفاسیر کی روشنی میں دیا ہے اور بتایا کہ آپ ﷺ ان تمام اعتراضات سے بالاتر تھے۔ سرسیّد لکھتے ہیں کہ

> مخالفین مذہب کا اعتراض دراصل آنحضرت ﷺ کی کثرتِ ازواج پر ہے۔ اس اعتراض کا یہودیوں، عیسائیوں اور بُت پرست قوموں کی طرف سے ہونا تعجب انگیز ہے، کیونکہ توریت یا صحف انبیاء یا انجیل میں تعدد ازواج کا رواج ہے۔ پھر کیا سبب ہے کہ وہ لوگ تعدد ازواج پر معترض ہوں، مگر یہ ایک جواب الزامی ہے جو ہماری نگاہ میں چنداں اہمیت نہیں رکھتا[۵۰]۔

ابطالِ غلامی

سرسیّد نے ایک رسالہ "ابطالِ غلامی" لکھا۔ یہ بھی دراصل اُن عیسائی مصنّفین کا جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مذہبِ اسلام میں غلامی ایک قابلِ مذمت امر نہیں ہے۔ سرسیّد نے اس رسالہ میں لکھا کہ

مسٹر رسل کی کتاب جو غلامی سے متعلق ہے، ایک اچھی کتاب ہے لیکن یہ پڑھ کر شدید دکھ ہوا کہ اسماعیل پاشا نے غلامی کی رسم کو مٹانے کے لیے جو کچھ کیا، وہ اُنھوں نے اپنے مذہب کے برخلاف کیا۔ لیکن [شکوہ] ان سے نہیں، دراصل ان مسلمانوں سے ہے جو غلامی کی رسم سے اس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ دوسری قومیں اسے ان کے مذہب کا جز تصور کرتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ انسانیت اور اسلام میں بُعد مشرقین ہے۔ سرسیّد نے اس رسالہ میں ثابت کیا کہ دینِ اسلام انسانیت و شرافت کے اعلیٰ ترین مدارج پر فائز ہے[51]۔

سرسیّد آگے لکھتے ہیں کہ یہودی مذہب نے غلامی کے قانون کو جائز سمجھا اور عیسیٰ مسیح نے اس کی نسبت کچھ نہیں کہا، مگر محمد ﷺ نے جو کچھ اس کی نسبت کہا اس کو کسی نے نہیں سمجھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الم نجعل لہ عینین ولسانا وشفتین و ھدینہ النجدین فلااقتحم العقبۃ وما ادراک ماالعقبۃ فک رقبۃ۔ (البلد: ۸)

(کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ اور کیا نہیں بتا دیے ہم نے اس کو دو گھاٹیوں کے راستے پھر وہ نہیں پھلانگ جاتا گھاٹی کو، تو جانتا ہے کہ وہ کیا گھاٹی ہے وہ غلام کا آزاد کرانا ہے۔)

آنحضور ﷺ نے فرمایا۔

ماخلق اللہ شیئا علی وجہ الارض احب الیہ من العتاق۔

(اللہ نے زمین کے پردہ پر کوئی چیز غلام آزاد کرنے سے زیادہ پیاری پیدا نہیں کی۔)

لڑائی کے قیدیوں کے متعلق قرآن میں صراحت کے ساتھ آیا ہے۔

فاما منا بعد و اما فداء (لڑائی کے بعد احسان کر کے یا فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دو۔)

اوپر سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ چیز اسلام کے بالکل منافی ہے۔ سرسیّد لکھتے ہیں کہ توریت اور انجیل میں غلامی کی ممانعت کی گئی ہے[52]۔ گاڈ فری ہگنز لکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ دونوں نے فرمایا کہ اوروں کے ساتھ وہی کرنا چاہیے جو اپنے ساتھ۔ اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے معتقدین کے یہاں غلامی کی رسم جاری ہے[53]۔ ایک دوسری جگہ وہ تحریر کرتے ہیں کہ محمد ﷺ نے غلامی کو موقوف کرنا مناسب خیال نہ کیا[54]۔

سرسیّد نے گاڈ فری ہگنز کے اس خیال پر یوں تبصرہ کیا کہ ان کا یہ خیال درست نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں یہ بات صراحت سے موجود ہے کہ بانی اسلام نے آئندہ کی غلامی کو قطعاً موقوف کر دیا ہے[55]۔

سر سید نے "خطبات احمدیہ" میں حدیث پر کھل کر بحث کی ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد ان کا مسلک حدیث بھی سامنے آجاتا ہے۔ اس میں انہوں نے حدیث متواترہ، مشہور اور خبر احاد کی تعریف کی ہے[56]، اور بتایا کہ علماء اسلام نے حدیث کی صحت اور تحقیق کے جو قواعد بتلائے ہیں، عیسائی علماء ان سے بالکل ناواقف ہیں اور درایت کے نام سے نابلد ہیں اور کسی گھٹیا کتاب کو پڑھ کر یہ دعویٰ شروع کر دیتے ہیں کہ وہ جزئیات اسلام سے واقف ہو گئے اور اسی بنیاد پر اسلام کی تضحیک کا آغاز کر دیتے ہیں جس سے ان کی بے علمی اور تعصب کا ترشح ہوتا ہے[57]۔

حدیث کی کتابوں کے سلسلے میں اسپرنگر کے خیال کا سر سید نے نوٹس لیا ہے۔ اسپرنگر کا کہنا ہے کہ اہل سنت والجماعت کے یہاں چھ کتابیں بخاری، مسلم، سنن ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ [صحیح کتابیں ہیں]۔ ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں جو اکثر کتب سابق پر مبنی ہیں جن کی سُنیوں کے یہاں بڑی قدر ہے۔ مثلاً دارمی، دار قطنی، ابن عینیہ، اصمعی، برقانی، سنن احمد، بیہقی، حمیدی، خطابی، بغوی، ابن الاثیر مبارک اور ابن جوزی، نووی۔

سر سید لکھتے ہیں کہ "اخیر کی چودہ کتابیں ہماری فہم کے مطابق پہلی چھ کتب پر مبنی نہیں ہیں۔ سوائے مشکوٰۃ کے جو بغوی سے اور اکثر ان میں کی غیر معتبر اور غیر مستند ہیں اور ان میں جو حدیثیں مذکور ہیں، وہ ان چھ کتابوں میں نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ کوئی حدیث ہو خواہ وہ پہلی قسم کی کتابوں میں ہو، نہ کسی مذہبی عقیدے کی بنا قرار پاتی ہے، نہ صحیح اور مستند تسلیم ہوتی ہے جب تک کہ وہ ان قواعد سے جو اوپر مذکور ہوئے صحیح نہ ثابت ہوتی ہو[58]۔"

ڈاکٹر اسپرنگر نے سورہ "والنجم" کے حوالہ سے بتایا کہ محمد صاحب نے قریش کے بتوں کی بہت تعریف کی ہے اور انہیں تسلیم کیا اور جب وہ سجدہ میں گئے تو قریش نے ان کی اتباع کی۔ اس کا ماخذ "مواہب لدنیہ" ہے۔ جس کے متعلق سر سید کا خیال ہے کہ اس میں مختلف روایتوں اور علماء کی آراء کو نقل کیا گیا ہے[59]۔

سر سید نے عیسائی مصنفین کے سلسلہ میں فرمایا کہ انہوں نے سرور کائنات ﷺ پر بے جا الزامات عائد کیے، لیکن اس پر ہمیں کوئی ملال نہیں کیونکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں[60]۔

قراءت قرآن

آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو سات قراءتوں پر نازل کیا[61]۔ اختلاف قراءت کی اصطلاح سے عیسائی مصنفین کو دھوکا ہوا، کیونکہ قرآن کریم کی قراءت مختلفہ کو انہوں نے عہدِ

عتیق اور عہد جدید کے اختلاف قراءت پر محمول کر لیا اور اس کا مطلب وہ ہے جو کہ رورنڈ مسٹر پارلی کہتے ہیں "دو یا زائد قراءت مختلفہ میں صرف ایک قراءت صحیح ہو سکتی ہے اور باقی یا تو کاتب کی عمداً تحریفات یا غلطیاں ہوں گی۔" یہ تو تھا ان کا خیال توریت و انجیل کے متعلق لیکن قرآن کی قراءت مختلفہ کا یہ مطلب نہیں ہے[۶۲]۔

رورنڈ مسٹر پارن نے عہد عتیق اور عہد جدید میں قراءت مختلفہ کے واقع ہونے کے یہ اسباب بتلائے۔ (۱) ناقلوں کی چوک اور غلطیاں (۲) منقول عنہ میں سقم اور غلطیوں کا موجود ہونا (۳) کاتبوں کا بدون کسی کافی سند کے متن کی عبارت کی اصلاح کی خواہش کرنا (۴) قصداً تحریفات کا کرنا جو کسی فریق کے حصولِ مدعا کے واسطے کی گئی ہوں۔

سر سید نے فرمایا کہ قرآن کریم کی قراءت مختلفہ سے ان اسباب کا کوئی علاقہ نہیں ہے، بلکہ اس کے اسباب درج ذیل ہیں۔

(۱) قرآن مجید کی آیات منتشر حالت میں موجود تھیں۔ ان سب کو اس کا علم نہیں ہوا تھا اس سبب سے آیتوں کو بترتیب پڑھنے میں اختلاف واقع ہوا۔ بعض لوگوں نے بعض آیتوں کو ان آیتوں کے ساتھ ملا کر پڑھا جن سے وہ ٹھیک طور پر علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ (۲) نقطوں کا اختلاف: قدیم تحریریں جس کے نمونے اب بھی ہمارے پاس موجود ہیں۔ نقطوں کے دینے کا رواج بہت کم تھا۔ (۳) مختلف قبائل جو مختلف اقطاع میں قیام پذیر تھے، ان کے مختلف لہجے تھے۔ (۴) اعراب کا اختلاف (۵) اور ایک ہی مادہ سے متعدد ابواب اور ان ابواب سے متعدد صیغے ہوتے جن کے تلفظ میں اختلاف ہوتا ہے[۶۳]۔ اختلاف قراءت پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن سے اس موضوع پر بخوبی روشنی پڑتی ہے[۶۴]۔

قرآن کریم

آنحضور ﷺ پر نازل ہونے والی یہ آسمانی کتاب روزِ اول سے معاندینِ اسلام کے نزدیک نزاع کا مسئلہ بنی رہی کہ کیا یہ آسمانی کتاب ہے یا نہیں؟ بہت سے عیسائی مصنفین نے اسے آسمانی کتاب تسلیم کیا اور بہتوں نے انکار کیا۔ اس پر سر سید نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے اور بتایا کہ چار چیزوں سے اس کی خوبی ثابت ہوتی ہے۔ (۱) اس کے نہایت صاف اور شستہ دل پر اثر کرنے والے اور چھانے والی فصاحت و بلاغت سے (۲) اس کے اصول متعلق بہ دینیات سے (۳) اس کے اخلاقی اصول سے (۴) قانون سیاست اور انتظام مدن کے اصول سے[۶۵]۔

گبن کا کہنا ہے کہ "پیغمبرِ خدا حرارت مذہبی یا جوش کی حالت میں اپنی رسالت کی صداقت کو اپنے

قرآن کی خوبی پر منحصر کرتے ہیں اور اس کے ایک صفحہ کی خوبیوں کی برابری انسان اور ملائکہ نہیں کر سکتے۔ ایسا بے نظیر کلام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔" یہی مصنف آگے کہتا ہے کہ "اگر قرآن کی تحریر استعداد انسانی سے متجاوز ہے تو ہومر کی ایلیڈ اور ڈیمو سستھینز کی فلپکس کس برتر عقل کی طرف منسوب کرنی چاہیے"[۶۶]۔

سر سید مسٹر گبن کی اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے کیونکہ اس کے اندر قرآن مجید اور صحیفۂ ایوب کے باہمی تفرق کی نسبت حکم دینے کا مادہ نہیں ہے۔ تمام ذی علم عربی دان حضرات نے قرآن کی فصاحت و بلاغت کو بے مثل قرار دیا ہے اور کوئی تحریر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی[۶۷]۔

مسٹر سیل نے قرآن کریم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ قرآن عرب کی شریف ترین قوم قریش کی زبان میں نازل ہوا جن کی زبان بے انتہا لطیف اور پاکیزہ ہے۔ اس میں کچھ زبانوں کی آمیزش ہے، لیکن وہ بہت کم ہے اور کوئی کتاب اس کے مثل نہیں ہے۔ رسالت محمدی کی صداقت کے لیے یہی اکیلا کافی ہے۔ یہ ایک لازوال معجزہ ہے جو مردے کو زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے[۶۸]۔

ہمفری ڈین آف ناروچ نے قرآن کریم کے متعلق بتایا کہ "محمد ﷺ لوگوں کو سکھاتے تھے، اس کتاب کا اصل مسودہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے اور جبرئیل میرے پاس ایک ایک سورہ کی نقل جس کی لوگوں میں شائع کرنے کی حسب موقع ضرورت ہوا کرتی ہے، لایا کرتے ہیں۔" سر سید اس پر یوں تنقید کرتے ہیں کہ یہ ایک ایسا بیہودہ بیان ہے جس پر لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سر سید نے مزید کہا کہ مسٹر گبن نے بھی اسی طرح کی جہالت کی باتیں کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے "وجود قرآن بقول آنحضرت ﷺ کے یا ان کے متبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الہیٰ میں موجود ہے اور نور کے قلم سے لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے۔ اس کی ایک نقل کاغذ پر لکھی ہوئی ریشم پر جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیل فلکِ اول سے لے آئے تھے"[۶۹]۔

حواشی

۱۔ اس سلسلے میں دیکھیے: اصغر عباس، سر سید کی صحافت، کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلّی ۱۹۷۵ء، ص ۲۱۹-۲۲۶

نیز ملاحظہ کریں: اشاریہ مندرجات "تہذیب الاخلاق" (مرتبہ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری)، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱-۳۰

2. J. M. S. Baljon, Jr., The Reforms and Religious Ideas of Sir Sayyid Ahmad Khan, Lahore, 1964, pp. 105-19

۳۔ راجہ طارق محمود، سر سید احمد خان، بک کارنر، جہلم پاکستان۔ ۱۹۸۸ء، ص ۲۵۷-۲۱۳ مزید دیکھیے: الطاف

حسین حالی، حیاتِ جاوید، اکادمی پنجاب لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۳۸۹-۸۷۳

4. Christian W Troll,Sayyid Ahmad Khan: A Re-interpretation of Muslim Theology,Vikas Publishing House,Delhi, 1976, pp. 58-99

۵- سر سیّد احمد خان، خطباتِ سر سیّد (مرتبہ محمد اسماعیل)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۴۹

نیز دیکھیے: Shan Mohammad, Sir Syed Ahmad Khan: A Political Biography, Merut, 1969, pp. 111-13.

۶- سیّد احمد، تبیین الکلام فی تفسیر التوراہ والانجیل علی ملۃ الاسلام، ۱۸۶۵ء، ۱، ۶۳ ص

۷- ایضاً، ۲۰-۳۱، تبیین الکلام کا خلاصہ پڑھنے کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری، برطانوی ہندوستان میں اسلام اور عیسائیت کا تامل- زندگی نو، علی گڑھ، فروری، مارچ ۱۹۹۲ء، ۱۵/۲، ۳، ص ۳۷-۴۶، ص ۳۱-۳۹

۸- سیّد احمد خان، جلاء القلوب بذکر المحبوب ﷺ، لیتھو گرافک پریس، دلّی ۱۲۵۹ھ، ص ۳-۶۳

۹- سر سیّد احمد خان، طعام اہل کتاب، علی گڑھ، ۱۸۶۱ء، ص ۳، سر سیّد کا یہ رسالہ تصانیف احمدیہ (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس، حصہ اوّل، جلد دوم، ۱۸۸۷ء، ص ۱۳۲-۱۸۸) میں شامل ہے۔

10. Sir William Meur, The life of Mohammad, Edinburgh, 1923, pp. 256.

۱۱- سر سیّد احمد خان، خطوط سر سیّد (مکتوب بنام محسن الملک) بار دوم، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص ۳۸

۱۲- ایضاً، ص ۳۲-۳۳

۱۳- خطباتِ سر سیّد، ص ۱۵۰

۱۴- حیاتِ جاوید، ص ۴۸۸-۴۹۰

۱۵- سر سیّد احمد خان، اسباب بغاوت ہند، پہلی بار، محبوب المطابع برقی پریس، دہلی ۱۸۵۸ء، ص ۴۳-۴۹

۱۶- خطباتِ سر سیّد، ص ۴۹

17. T.W. Arnold, The Preaching of Islam, 1896. pp. 1-317.

۱۸- خطباتِ سر سیّد، ص ۲۳۹

۱۹- خطباتِ سر سیّد، ص ۶۱

۲۰- سر سیّد احمد خان، الخطبات الاحمدیہ، نول کشور سٹیم پریس، لاہور (بدون تاریخ)، ص ۱۲

۲۱- الخطبات الاحمدیہ، ص ۱۳

۲۲- ایضاً، ص ۱۴

۲۳- ایضاً، ص ۱۵

۲۴- ایضاً، ص ۱۶

۲۵- ایضاً، ص ۱۹

۲۶- مکتوباتِ سر سیّد، ص ۳۵

۲۷- ایضاً، ص ۵۰
۲۸- الخطبات الاحمدیہ، ص ۲۰
۲۹- ایضاً، ص ۱۵
۳۰- ایضاً، ص ۲۱
۳۱- ایضاً، ص ۳۱
۳۲- ایضاً، ص ۱۰۶
33.Charles Forster, The Historical Geography of Arab, London.
۳۴- الخطباتِ الاحمدیہ، ص ۱۰۶-۱۰۷
۳۵- ایضاً، ص ۱۱۱
۳۶- ایضاً، ص ۱۱۱-۱۱۳
۳۷- ایضاً، ص ۲۱۴
۳۸- ایضاً، ص ۲۱۵
۳۹- کیا اسلام تلوار کے بل پر پھیلا؟ اس کے تفصیلی جواب کے لیے دیکھیے: سید ابوالاعلیٰ مودودی، الجہاد فی الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی- ۱۹۸۱ء، ص ۲۱-۶۰۰
۴۰- الخطبات الاحمدیہ، ص ۲۲۴-
۴۱- ایضاً، ص ۲۲۵
۴۲- ایضاً، ص ۲۲۷
۴۳- ایضاً، ص ۲۳۱-۲۳۲
۴۴- ایضاً، ص ۲۳۶
۴۵- ایضاً، ص ۲۳۹-۲۴۰
۴۶- ایضاً، ص ۲۴۷
۴۷- ایضاً، ص ۲۴۵-۲۴۶
۴۸- ایضاً، ص ۲۴۶
۴۹- سر سید احمد خان، ازواجِ مطہرات (یعنی جواب امہات المومنین) مطبوعہ تجارتی پریس، علی گڑھ، بدون تاریخ، ص ۱-۲
۵۰- ایضاً، ص ۵
۵۱- سر سید احمد خان، ابطال غلامی، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۳ء، ص ۱۷
۵۲- الخطبات الاحمدیہ، ص ۲۶۳-۲۶۴
۵۳- ایضاً، ص ۲۶۴
۵۴- ایضاً، ص ۲۶۳-۲۶۴

۵۵- ایضاً، ص ۲۶۷
۵۶- ایضاً، ص ۳۵۳-۳۵۵
۵۷- ایضاً، ص ۳۵۶
۵۸- ایضاً، ص ۳۵۷
۵۹- ایضاً، ص ۳۸۵
۶۰- ایضاً، ص ۳۸۳
۶۱- مسند احمد بن حنبل، باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف
۶۲- الخطبات الاحمدیہ، ص ۴۲۸
۶۳- ایضاً، ص ۴۲۹-۴۳۱
۶۴- ایضاً، ص ۴۶۰
۶۵- ایضاً، ص ۴۶۰
۶۶- ایضاً، ص ۴۶۰-۴۶۱
۶۷- ایضاً، ۴۶۲
۶۸- ایضاً، ص ۴۶۳
۶۹- ایضاً، ص ۴۶۷